کمرے میں داخل ہوکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی کہنیاں گھٹنوں پہ ٹکائیں اور سرکو ہاتھوں میں لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ خوش قسمتی سے یہ مختصر سا ریلا کوئی آدھ گھنٹے میں گزر گیا۔ بعد میں وہ دیر تک سر کے پیچھے ہاتھ باندھے آنکھیں بند کیے چارپائی پر لیٹا رہا۔ بیچ بیچ میں وہ آنکھیں کھول کر سامنے دیوار کو دیکھتا جہاں دھوپ کی کھڑکی بنی تھی اور اس کے وسط میں مٹی ابھر کر دراڑ کی شکل میں پھٹ گئی ہوئی تھی۔ دھوپ کے اس چوکھٹے میں ایک چھپکلی اپنی بے جھپک آنکھیں والیے ساکن بیٹھی دیوار کے سکوت میں اضافہ کر رہی تھی۔ سکوت ایسا تھا کہ دھوپ کے راستے میں ایک ذرہ تک نہیں اُڑ رہا تھا۔ یہ پہاڑوں کی ہوا ہے، اسد نے خیال کیا۔ اُسے یہ احساس تھا کہ کمان کی طرح تنے ہوئے اس سکوت کے اندر گاؤں کی زندگی میں دل شکنی اور خوف کی ایک کھلبلی تھی ـــــ اور اس کمان کے کناروں پر کہیں یہ شخص ابھی مارا مارا پھرتا تھا، آرام بانٹتا ہوا، متین اور باضبط اور خوش اخلاق، جس نے خود اپنی سعی بالجبر سے اپنے آپ کو آج اس مقام پہ لا کھڑا کیا تھا جہاں پر گولی کی طرح چھوٹتے ہوئے ایک لفظ نے بالآخر اس کی ہڈیوں تک کو برہنہ کر کے رکھ دیا تھا۔ مدت ہوئی کہیں سے یہ آدمی اکھڑے ہوئے درخت کی مانند بہتا ہوا ادھر آ نکلا تھا، اور اس زمین میں کسی طور جم کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سالہا سال تک وہ ان کے درمیان رہتا چلا گیا تھا۔ اس کی گردن میں خم نہ اس وقت آیا تھا نہ اب ہے، اور اگر تھا تو عجیب سا جو نظر نہ آیا تھا۔ وہ ایک علم کا راز سینے میں لیے یہاں وارد ہوا تھا، اور اس جگہ کا انتخاب کر کے یہاں رہنے لگا تھا، مگر ان لوگوں کی طرح نہیں جو سادگی کے ساتھ زمین سے اور آسمان سے اور جنگلوں پہاڑوں سے اپنا حق مانگتے تھے اور وصول کرتے تھے، وصول کیے جاتے تھے۔ یہ شخص دینے والا تھا، اور اسی بنا پر اُن سے الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ مگر بالآخر وہ اپنے علم کا ثبوت فراہم نہ کر سکا تھا۔ یہ کہ وہ آرام تقسیم کرتا تھا ایک غیر اہم سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ کیسی عجیب بات ہے، اسد سوچتا رہا۔ اگر یہی شخص جادو کا داعی ہو کر، یا آزادی کا نعرہ لے کر، یا کسی ان دیکھی بے مقام دُنیا کا پیغام لے کر گُشد میں آتا تو یہ دہقان جوق در جوق، سوال جواب کیے بغیر اس کی ولایت میں داخل ہونے کو چلے آتے۔ دلوں کا سکون بانٹنا، جسم کا آرام بانٹنے کی نسبت کتنا آسان ہے، اسد نے سوچا ـــــ وہ اپنے خیال کی پیچیدگی سے گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے میں سے اُس نے دیکھا کہ احاطہ خالی پڑا ہے، سوائے ولی کے جو اسد کا برتن لیے بیٹھا اس کے اندر کا سفوف آہستہ آہستہ، سات اور نو کے چکروں میں پیس رہا تھا۔ ولی کے سوا سب کو چھٹی مل چکی تھی اور اُن کے برتن گھر کے دروازے پر رکھے تھے۔ صرف میر حسن کا برتن اُسی طور گرا پڑا تھا جس طرح میر حسن اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد حکیم مطب سے برآمد ہوا اور اپنی مستعد چال کے ساتھ احاطے سے نکل کر گھر کے اندر چلا گیا۔ اسد اپنے کمرے سے نکل کر ولی کے پاس جا بیٹھا۔

"تمہیں اس پہ یقین ہے؟" کچھ دیر بعد ولی نے اپنی لمبی اور چوڑی ٹھوڑی سے مطب کی طرف اشارہ کر کے

پوچھا۔

"پتا نہیں۔" اسد نے بات ٹالتے ہوئے کہا، "تمہیں ہے؟"

"اونہوں۔" ولی نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر وہ سوچ میں پڑ گیا، جیسے کسی مخمصے میں ہو۔ "مگر ایک بات ہے۔"

"کیا؟"

"اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"پھر بھی تمہیں اس پہ یقین نہیں؟"

"اونہوں۔"

"کیوں؟"

"یہاں پر۔" ولی نے سینے پر ہاتھ مارا، "مجھے پتا ہے۔ بندوق اس کے پاس ہے۔"

اسد نے حمام میں سے چٹکی بھر سفوف نکالا اور انگلیوں میں اسے مل کر دیکھا۔ "ہو گیا۔" اس نے کہا اور حمام دستہ ولی کے ہاتھ سے لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک چنار کے نیچے اس نے جھک کر میر حسن کا گرایا ہوا برتن اور لکڑی کا چمچ اٹھایا، اور دونوں برتنوں کو لیے گھر کی جانب چل پڑا۔ گھر کے دروازے پر پڑے ہوئے دو اور برتن اس نے اٹھائے اور دونوں ہاتھوں میں چار برتن لیے گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں خاموشی تھی۔ کچھ دیر تک وہ باورچی خانے میں کھڑا باہر شمال کی طرف سے اٹھتی ہوئی ہوا کی آواز کو سنتا رہا۔ پھر وہ باورچی خانے سے نکلا اور گھر کے چھوٹے سے صحن کو عبور کر کے حکیم کے کمرے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اندر حکیم گردن اور کندھوں کے گرد تولیہ لپیٹے چارپائی پر بیٹھا تھا اور یاسمین اس کے سر میں بادام روغن لگا رہی تھی۔ دونوں کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ کچھ دیر تک اسد دروازے پہ کھڑا باپ بیٹی کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ کمرے میں داخل ہوا اور ہلکے ہلکے قدم رکھتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ حکیم آنکھیں بند کیے بیٹھا، دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا:

"دیکھو، ضد مت کرو۔ بندوق میرے پاس نہیں۔"

"میں نہیں مانتی۔" یاسمین نے کہا۔

"تم تو تعلیم یافتہ ہو، بیٹی۔ عقل کی بات کرو۔ اگر میرے پاس ہو بھی تو یہ بندوق چھوٹے موٹے پرندوں کے شکار کے واسطے ہے۔ اس سے بھلا شیر کا شکار ہوتا ہے؟"

"جو کچھ بھی ہے، ان لوگوں کے حوالے کر دینے میں آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

"تو گویا تم چاہتی ہو کہ میں بھی ان لوگوں سے مل کر بیوقوفی کی حرکتیں کروں؟"

" بیوقوفی کی کیا بات ہے۔ یہ لوگ ایک پرسچ پرچ کے خطرے سے دوچار ہیں۔ آپ ان کی مدد نہیں کر سکتے ؟"

" بیشک ۔" حکیم نے یاسمین کے تیز تیز چلتے ہُوئے ہاتھوں کے نیچے سر ہلایا ، "جب میں دیکھوں گا کہ پرسچ پرچ کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے تو جو کچھ میرے اختیار میں ہُوا کروں گا ۔"

حکیم تولیہ گردن سے اُتار کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ یاسمین تیل کی بوتل پر ڈھکنا رکھ کر ہاتھوں کو ایک دسترخوان سے رگڑ رگڑ کر خشک کرنے لگی ۔

حکیم اسد کو دیکھ کر چونکا : "تم یہاں کیا کر رہے ہو ؟"

" کچھ نہیں ۔" اسد نے جواب دیا۔ پھر وہ بولا : "یہ کیوں بندوق اُن کے حوالے کرنے پر ضد کر رہی ہے ؟"

حکیم ایک لحظے تک ٹھٹھک کر اسد کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ "پاگل مٹی ہے ۔" وہ یاسمین کی طرف دیکھ کر پیار سے بولا ، اور کمرے سے نکل کر غسل خانے کو چلا گیا۔ یاسمین کے ہاتھ دسترخوان پر رُک گئے۔ اُس کا رنگ ہلکا سا زرد پڑ گیا اور وہ اپنی جگہ پر بے حرکت کھڑی کپڑے کا گیند بنا کر آہستہ آہستہ اُسے دبانے لگی۔ اسد سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا ۔

" ظاہر ہے ۔" وہ بولی ۔ "ایک خطرناک درندے کو ہلاک کرنے کے لیے ۔"

"جنگل درندوں سے بھرا پڑا ہے۔ تم بندوقیں لیے اُن کے پیچھے تو نہیں دوڑتے پھرتے صرف اس لیے کہ وہ درندے ہیں ؟"

" اس قسم کے درندے نہیں ۔ یہ خطرناک درندہ ہے جو صرف دہاڑ دہاڑ کر لوگوں کو خوفزدہ کرتا رہتا ہے ، اور جنگل سے نکل کر کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے "

"تم نے سُنا اُس بڈھے نے ابھی کیا کہا ہے ؟"

" میں نے کچھ نہیں سُنا ۔"

" سارے گاؤں نے سُنا ہے ۔" اسد نے غصّے سے کہا ۔ " ان کی نظروں میں تمہاری یہ عزّت ہے ۔ . . ."

" عزت وزت کا سوال نہیں ۔ یہ سارے گاؤں کا معاملہ ہے ، ہمارا یا اُن کا الگ الگ نہیں ۔"

" شاید تم بھی ان لوگوں کی طرح ایک خیالی خوف سے مری جا رہی ہو ؟"

یاسمین کا ہاتھ جیسے غیر ارادی طور پر اپنے حلق کی طرف اُٹھا اور اُس نے اُنگلیوں کے پوروں سے ہولے ہولے گلے کو ملنا شروع کیا ، جیسے بات کی شدّت سے اُس کا حلق بند ہُوا جاتا ہو۔ اُس کی نظریں لپک کر اسد کی آنکھوں

سے ملیں۔

"مجھے کوئی خوف نہیں تم جانتے ہو میں اس سے نہیں ڈرتی۔" ایک لمحے کو رک کر وہ پھر بولی، "تمہیں ثبوت چاہیے؟ میں آج رات کو اکیلی جنگل میں جاکر دکھا دوں گی۔"

اسد کے اندر غصے کی لہر یک دم سرد پڑ گئی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یاسمین کو دیکھنے لگا۔

"پاگل ہوئی ہو؟"

"تم نہیں آنا چاہتے تو مت آنا۔" یاسمین ایک بے وجہ سرکشی سے بولی۔

اسد آخر اپنے آپ کو سنبھال کر مسکرایا: "مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم گئی ہو؟"

حکیم غسل سے فارغ ہو کر کمرے میں لوٹ آیا۔ وہ آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور لکڑی کے کنگھے سے اپنے چھوٹے چھوٹے سفید بالوں میں پیچھے سے آگے کی طرف کنگھی کرنے لگا۔ اسد گھر سے نکل گیا۔

(۴)

اسد کمرے کی بتی کو پھونک سے بجھا کر باہر نکل آیا۔ دروازہ بھیڑتے ہوئے اُس نے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ شام ہونے ہونے آسمان پر بادلوں کی ایک تہہ چڑھ آئی تھی۔ اس وقت چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ اسد نے یاسمین کے کمرے کی کھڑکی کو دیکھا، دل میں مرہوم سی اُمید لے کر کہ شاید وہ باہر نہ گئی ہو، شاید اُس کھڑکی میں روشنی کی دراڑیں نظر آئیں اور وہ جا کر اپنی انگلی ہولے ہولے تین بار اُس پر بجائے، پھر ایک لمحے کا وقفہ دے کر دوبارہ تین بار، پھر لیمپ کی بتی نیچی ہو اور یاسمین کا جسم آگے آ کر روشنی کی دراڑوں کو بند کر دے، ہولے سے کنڈی کے اُترنے کی آواز آئے، پٹ ایک انچ کھُلے، پھر تیزی سے کھُل جائے اور اُس کا گرم گرم دانتوں والا خاموشی سے ہنستا، تمتماتا ہُوا چہرہ نمودار ہو۔ وہ اپنی کُہنیاں کھڑکی میں رکھ کر اپنا بوجھ اُن پر ڈالے اور آگے کو جھک آئے اور خواہ گھپ اندھیرا ہو اُس کے شانوں کے، بازوؤں کے پھاتی کے اور ہرن کی سی لہراتی ہوئی لمبی پُشت کے تنے ہوئے جسم پھیلاؤ چاندنی کے خطوط کی مانند واضح ہو جائیں۔ اسد نے دیکھا کہ کھڑکی بند اور ہیجان پڑی تھی، جیسے کبھی کھولی نہ گئی ہو۔ وہ خیال کر کے دِل میں حیران ہوا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب کوئی شے ہیجان ہو جائے، تو اِس بات کے امکان بھی کہ کبھی یہ جاندار

اور محرّک رہ چکی ہے یاد میں لانے محال ہو جاتے ہیں۔ اپنے احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہُوا وہ اُونچی نیچی تنگ گلیوں میں داخل ہُوا جن سے نکل کر اُسے گاؤں کے بائیں ہاتھ کو پہنچنا تھا۔ گلیوں اور گھروں میں اندھا اندھیرا تھا، اور دروازے اس طرح جامد تھے جیسے کوئی سانس لیتا ہوا ذی رُوح اُن کے پیچھے موجود نہ ہو، صرف مدّتوں سے ہوا اندر رُکی ہُوئی ہو۔ چند منٹ کے اندر وہ دیواروں کو پیچھے چھوڑ کر اُس میدان کے کنارے پہ کھڑا تھا جس کی چٹیل سفید سطح اندھیری رات میں چاندی کے تھال کی طرح جھلملاتی تھی۔ آج اِس رات کے اندھیرے میں یہ میدان بھی غائب ہو چکا تھا۔ آنکھیں پُوری کھول کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہُوئے اسد نے میدان کے پرے درختوں میں نظر دوڑائی۔ تاریکی میں ایک جگہ پر اُسے دو چمکتی ہُوئی آنکھیں نظر آئیں۔ اُس نے نظر ہلا کر دیکھا تو آنکھیں نظر کے ساتھ ہل گئیں۔ یہ اُس کی اپنی آنکھوں کے تارے تھے۔ مئی کا مہینہ تھا اور موسم میں خنکی زائل ہو چلی تھی۔ ایک پتے کے ہلنے کی آواز نہ آ رہی تھی۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھا اٹھا کر رکھتا ہُوا میدان پار کرنے لگا۔ اُس کے سر کے چاروں طرف آنکھیں لگی تھیں اور اُس کا ایک ایک انگ چھوٹی سے چھوٹی آواز کی حرکت پہ بدکنے کے لیے تیار تھا۔

ایسی اندھیری رات میں، اسد نے سر کو مُتتقل دائیں بائیں پھراتے ہوئے سوچا، یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس کو یاسمین پہ غصّہ آ رہا تھا۔ ایک انجانے سے خوف کے مارے اُس نے قدم تیز کر دیے۔ وُہ تین چوتھائی میدان طے کر چکا تھا کہ ایک زوردار ضرب سے پلٹ کر گرا، جیسے زناٹے کا تھپڑ کسی نے اُس کی کنپٹی پر رسید کیا ہو۔ اُس کے کان سُن ہو گئے اور آنکھوں میں تارے ناچنے لگے۔ وہ اپنے پاؤں پہ بیٹھا، ہاتھوں پہ جسم کے بوجھ کو سہارے ہونقوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھنے لگا، پھر اگلے ہی لمحے چاروں ہاتھوں پاؤں کے زور پہ گیند کی طرح اُچھل کر دُور جا گرا۔ گرتے ہی اُس کا ہاتھ ایک گول سے پتھر پہ پڑا جو اس نے اُٹھتے اُٹھتے پکڑ لیا۔ اب اُس کی صورت کچھ اس طرح تھی کہ ایک پاؤں اور ایک گھٹنے کے بل ادھ کھڑا، اُس بھاری پتھر کو ہاتھ میں تانے، ذرا سے اشارے پہ مارنے کے لیے تیار، اندھیرے میں منجمد ہو گیا تھا جب کہ اُس کی آنکھیں اپنی حدوں سے باہر تک پھیلی ہُوئی تھیں اور سر برابر دائیں اور بائیں چل رہا تھا۔ ایک سکوت کا عالم تھا جو توڑے نہیں ٹوٹتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس تاریکی سے ایک مدھم سا سیاہ، دراز قد ہیولا اس کی نظروں کے سامنے اُبھرا۔ اُس کا دل ایک بار بہت زور سے دھڑکا اور بیٹھ گیا۔ تیزی سے کئی بار آنکھوں کو جھپک کر اُس نے پھر اُنہیں آخری حد تک پھیلایا۔ اُس ہیولے میں کوئی حرکت نہ ہُوئی مگر اُس کی لمبائی اندھیرے میں بڑھنے لگی۔ یکبارگی اسد کے منہ سے ایک گالی نکلی۔ وہ پتھر کو ہاتھ سے پھینک کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور جُھک کر گھٹنے کو سہلانے لگا۔ میں اِدھر کیسے آ نکلا، اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ تاریکی میں وہ میدان کے بیچ بیچ چلنے کی بجائے کوئی پندرہ قدم دہنے ہاتھ کو بھٹک گیا تھا، اور بے خبری میں پُرانی

رفتار کے ساتھ اُس کا ماتھا اُس جلے ہُوئے چیڑ کے تنے سے جا ٹکرایا تھا جو اُس میدان کا اکلوتا درخت تھا۔ جہاں پہ وہ کھڑا تھا وہاں سے اندازہ کر کے اُس نے اپنی چٹان کا رُخ کیا۔ یہ چٹان درختوں کی اُس آبادی کے کنارے پر زمین میں گڑی تھی اور جنگل والے رُخ پہ اندر سے کچھ دُور تک کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اُس کھوہ میں جہاں دو آدمیوں کے بخوبی کھڑے ہونے کی جگہ تھی، دن کے وقت چرواہے بچے کھیلا کرتے تھے۔ اسد چٹان سے کچھ فاصلے پر تھا کہ دبی دبی ہنسی کی آواز اُس کے کان میں پڑی۔ آخری چند قدم تقریباً دوڑتا ہوا وہ کھوہ میں یاسمین کے برابر جا کھڑا ہُوا۔

"کیوں ہنس رہی ہو؟"

"بس۔" وہ دلرُبائی سے تھوڑی ہوا میں اُٹھا کر بولی۔ اندھیرے میں اُس کی آنکھوں کی چمک بہت مدھم مگر بہت شدید تھی۔

"کوئی وجہ؟" اسد نے کہا۔

"تم درخت سے ٹکریں کیوں مار رہے تھے؟" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"تم دیکھ رہی تھیں؟"

"ہاں۔"

"کہاں سے؟"

"وہاں سے۔" یاسمین نے تھوڑی سے درختوں کی جانب اشارہ کیا۔

"تم وہاں تھیں؟"

"ہاں۔"

"کب؟"

"ابھی۔"

"میرے گھٹنے میں چوٹ آئی ہے۔" وہ بولا۔

"ارے۔" یاسمین نے جلدی سے بیٹھ کر اُس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ نہیں۔۔۔ دُوسرا۔۔۔"

"پکا پتا ہے؟"

"ہاں۔" وہ سختی سے بولا۔ "ایسی رات میں یہاں آنے کی بھلا کیا تُک ہے؟"

"چلی جاؤں؟" یاسمین کی آواز میں ہنسی کی کھنک تھی۔

"اب آگئی ہو تو رُک ہی جاؤ۔" اسد نے کہا۔
یاسمین نے ایک لمبی سی "اچھا؟" میں جواب دیا۔ دونوں ہنسنے لگے۔
یاسمین اُٹھی اور کھوہ سے باہر نکل کر چل دی۔
"کہاں جا رہی ہو؟"
"وہاں۔"
"وہاں کہاں؟"
"یہاں" وہ ایک درخت کے ساتھ پُشت لگا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔
اسد نے تیزی سے ایک نظر چاروں طرف دوڑائی۔ "احمق!" وہ بولا۔
"یہی دیکھنے آئی ہوں" یاسمین نے دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر تنے پر رکھ دیے، جیسے اُسے ڈر ہو کہ کوئی اُسے درخت سے یا درخت کو اُس سے چھین کر نہ لے جائے۔
"کیا؟"
"احمق میں ہوں یا تم؟"
"کیسے؟"
"تم کہتے تھے کہ وہ یہاں تک نہیں آتا، نیچے اپنے جنگل میں رہتا ہے۔"
"ہاں۔"
"پھر ڈر کیوں رہے ہو؟"
"کہاں ڈر رہا ہوں؟"
"ایک لمحے کو تمہاری نظر نہیں رُکتی۔ ہر طرف گھوم رہی ہے۔"
"تم دیکھ سکتی ہو مجھے؟"
"اور کیا۔"
"کہاں ہوں میں بھلا؟" وہ جلدی سے پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ یاسمین نے بات کیے بغیر ہاتھ بڑھا کر اُس کے بالوں کو چھوا۔ سر اُٹھا کر اسد نے یاسمین کو، اور اُوپر درخت کے اندھیرے کو دیکھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔
"اِس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ڈر رہا ہوں۔"
"تم کہتے نہیں کہ وہ یہاں پر نہیں آتا؟"

"کہتا ہوں ۔"

"مگر تمہیں اپنی بات پر یقین نہیں ۔"

"کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہو ۔"

"تم جو کہتے ہو تمہارا اپنا اُس پہ یقین نہیں ۔" یاسمین نے دہرایا۔

"مَیں کہتا ہوں وہ نہ یہاں آتا ہے نہ کسی پر حملہ کرتا ہے ۔"

"تو پھر کیوں اُسے ہر طرف تلاش کرتے پھر رہے ہو ؟" یاسمین کی آواز میں گویا ایک فریاد تھی۔ اسد نے آہستہ سے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"چلو ۔" وہ بولا۔

"کہاں ؟"

"وہاں ۔" اسد نے چٹان کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ٹکٹکی لگائے اسد کی طرف دیکھتی رہی، مگر اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ پُشت میں چُبھتے ہُوئے تنے کو اُس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا اور دُور، دُور جھلملاتی ہُوئی اُس کی آنکھیں اسد کی آنکھوں میں چھید کر رہی تھیں۔ دفعتہً اُن کے پاس ایک تیز سرسراہٹ کی آواز پیدا ہُوئی۔ اسد اُچھل پڑا۔ اُس کا جسم مدافعت کے انداز میں تن گیا اور وہ پہلو بدل کر اندھیرے کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ یاسمین کی ایک اُنگلی تک نہ ہلی، وہ اُسی انداز میں کھڑی ایک ٹک اسد کو دیکھتی رہی۔ اُس کی طرف دیکھے بغیر اسد کو برابر یہ احساس رہا کہ اُس لڑکی میں ذرہ برابر لغزش نہیں آئی۔ وہ دل میں اس بات پہ جھلّا اُٹھا۔ ایک خیال اُس وقت تیزی سے اُسے آیا اور گزر گیا کہ اگر وہ اُس وقت دیکھ سکتا تو ایک سرد اور بیجان چہرہ وہاں دیکھتا۔ سرسراہٹ کی آواز تیزی سے بڑھتی گئی۔ اسد کو اب احساس ہُوا کہ آواز اُن کے پاس سے نہیں، اُوپر سے آ رہی تھی۔ اتنے میں پانی کے بڑے بڑے قطرے شاخوں میں سے چھن کر اُن کے سروں پہ ٹپکنے لگے۔

"چلو ۔" وہ یاسمین کا بازو ہاتھ میں لے کر بولا۔ ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے وہ چٹان کی کھوہ میں آ کھڑے ہوئے۔ یہ جگہ بارش سے محفوظ تھی۔ مگر اتنی سی دیر میں اُن کے کپڑے آدھے بھیگ چکے تھے۔ اب گیلی ہوا کے جھونکے آنے شروع ہوئے اور بہت اُونچائی پہ بادلوں میں مدھم مدھم بجلی چمکنے لگی۔ کھوہ کی زمین صاف ستھری اور ہموار تھی، اور وہ پتھریلی دیوار کے ساتھ، کندھے سے کندھا لگائے کھڑے تھے۔

"بارش کے کوئی آثار نہ تھے ۔" ... نکلا تو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بادل اتنی خاموشی

سے آئے ہیں۔"

"ہاں۔"

"یاس ہے"

"ہوں۔"

"کیوں یہاں آئی ہو؟"

"بتایا تو ہے۔" وہ خاموشی سے بولی، "دیکھنے۔"

"کیا دیکھنے؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں کیا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تو پھر؟" اسد نے پوچھا۔ اُس کی آواز میں اب غصّے کی رمق تک نہ تھی، ایک تحمّل تھا۔ "اتنا اندھیرا تھا۔"

"ہاں۔"

"تو پھر؟"

یاسمین زمین پر بیٹھ گئی۔ اُس نے کھوہ کی دیوار سے ٹیک لگالی اور گھٹنوں پر ہاتھ اور ہاتھوں پر ٹھوڑی رکھ کر ایک لحظے کو آنکھیں میچ لیں۔

"اسد۔" وہ بولی، "کوئی اور بات کرو۔"

اسد اُس کے ساتھ پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ بجلی اب آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی، اور ساتھ بادلوں کی ہلکی ہلکی گرج سُنائی دینے لگی تھی۔ بارش پہلے زور دار چھینٹے کے بعد تھم گئی تھی، اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ نیم گیلے جنگل اور پہاڑ کی مخصوص خوشبو چاروں طرف سے آ رہی تھی۔ اسد خاموش بیٹھا، ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالے سامنے زمین کو دیکھے جا رہا تھا جو بجلی کی چمک میں بار بار تیزی سے سفید اور سیاہ ہو رہی تھی۔ یاسمین نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے بالوں میں اُنگلیاں ڈال دیں اور ہلکے ہلکے پوروں سے اُس کے سر کے پچھلے حصّے کو سہلانے لگی۔

"تم نے وہ نظم لکھی ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔" اسد نے کہا، "یاس؟"

"ہاں۔"

"میں سوچ رہا تھا ایک آدھ ہفتے کے لیے چلا جاؤں۔"

"کہاں؟" یاسمین نے دہل کر پوچھا۔

"چچا بیمار ہیں۔"

"خط آیا ہے؟"

"ہاں۔"

"کب؟"

"جمعے کو۔"

"تم اپنے چچا کو یہاں کیوں نہیں لے آتے؟"

"کس لیے؟"

"علاج کے لیے۔"

"تمہارے باپ کے پاس؟" اسد نے طنز سے کہا۔ پھر وہ خود ہی اس بات پہ پشیمان سا ہو گیا۔ یہ پہلی بار تھی کہ حکیم کے بارے میں اس کا ردِ عمل کچھ الجھ سا گیا تھا۔

"شاید کچھ آرام آجائے۔" یاسمین نے کہا، "اس عمر میں تھوڑے بہت آرام کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔"

"ہاں،" اسد بولا، "سردی ہو رہی ہے۔"

"ہاں۔"

"یاس، ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"سچ سچ؟"

"سچ سچ۔"

"بندوق تمہارے باپ کے پاس ہے؟"

"چار پانچ سال پہلے تک تھی۔"

"پھر کہاں گئی ہے؟"

"پھر غائب ہو گئی۔"

"کہاں تھی ہے؟"

"گھر میں پڑی تھی۔" مسلسل چمکتی ہوئی بجلی کے اندر یاسمین اپنی لمبی لمبی نیم بھیگی آنکھوں سے برابر اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ "اسد،" وہ بولی، "تم خوش ہو کہ ابا نے بندوق نہیں دی۔"

اسد خاموش بیٹھا رہا۔

"میں جانتی ہوں تم خوش ہو۔"

"تم سب کچھ جانتی ہو۔" اسد طنز سے بولا۔ "میرے دل کا حال تم سب جانتی ہو۔"

"سارے علاقے کو اس درندے نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔ ایک آدمی کو ہلاک کر چکا ہے، اور تمہارے دماغ پر ایسے یہ چھایا ہوا ہے جیسے کوئی بہت عجوبہ چیز ہو۔"

"ہاہا۔ میرے دماغ پہ چھایا ہے یہ، دماغ پہ تو تم لوگوں کے چھایا ہے جیسے کوئی آفت آگئی ہو۔ نہیں پتا ہے میں نے وہ پنجرہ دیکھا ہے۔ کوئی چھ سال پرانا ہے۔ اس کی پسلیوں میں پودے اُگ رہے ہیں۔ کوئی سانپ کا کاٹا مر گیا ہوگا کبھی زمانے میں اب اس بیچارے کے سر تھوپ رہے ہیں۔"

"بیچارہ ہے تم تو ایسے بات کرتے ہو جیسے کوئی تمہارا عزیز ہو۔"

"اس کا کوئی قصور نہیں، بے گناہ جانور ہے۔ صرف اس لیے اس کی جان کے پیچھے پڑ جانا کہ اس طرف آنکلا ہے اور جنگل میں کھڑا ہو کر گرجتا ہے کہاں کا انصاف ہے؟"

"اسد تم عجیب آدمی ہو۔ میں نے کبھی کسی کو ایک درندے کے بارے میں ایسی باتیں کرتے نہیں سنا۔"

اسد اکڑوں بیٹھا زمین کو گھورتا رہا۔

"تم کیوں ہر وقت اس کا خیال کرتے رہتے ہو؟" یاسمین نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" اسد نے جواب دیا۔

"پتا نہیں۔ پتا نہیں۔ ہر بات میں کہتے ہو پتا نہیں۔"

بجلی اب بغیر رُکے چمک رہی تھی۔ اسد وہیں بیٹھا سامنے جنگل کو دیکھتا رہا جو اب مسلسل اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا، اِس طرح کہ ایک ایک سیکنڈ پر تیز سفید روشنی میں چمک اُٹھتا، پھر گھپ اندھیرے میں اُس کا سفید نقشہ آنکھوں کے سامنے گھومتا، اور اِس سے پہلے کہ یہ عکس تحلیل ہو جنگل پھر ایک بار روشن ہو جاتا۔

"اسدی۔" یاسمین نے ڈرتے ڈرتے اُسے بُلایا۔

"ہوں۔"

"کبھی تم مجھے اپنے گاؤں لے جاؤ گے؟"

"ہاں۔" پھر اچانک کسی خیال سے اسد کا ماتھا کھل اُٹھا۔ وہ یاسمین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، "چلو جاگ چلیں۔"

"اوہنوں۔" وہ خاموشی سے سر ہلا کر بولی۔

"کیوں؟"

"ایسے نہیں، اسدی۔" یاسمین نے آرام سے جواب دیا۔ پھر بولی: "شہر بھی لے جاؤ گے؟"

"ہاں۔"

"کسی بڑے شہر میں چلیں گے۔" وہ فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔

"ہاں۔" اسد نے کہا، "پنڈی؟"

"نہیں۔" وہ بولی، "لاہور۔"

"ٹھیک ہے۔ لاہور۔"

اب وہ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے یاسمین کے مسلسل روشن ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا، اور یاسمین کی آنکھیں جنگل پر لگی تھیں۔ بادل اب اُن کے سروں پہ آ آئے تھے اور اُن کی گھن گرج تیز ہو گئی تھی۔

"تم لاہور کبھی گئے ہو؟"

"ہاں۔"

"ہم وہاں جا کر کیا کریں گے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"فلم دیکھتے جائیں گے۔" اسد نے سوچ کر جواب دیا۔

"تم وہاں کسی کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔"

"ہاں۔" کچھ دیر بعد وہ اسد کی طرف مُنہ موڑ کر خوشی سے بولی، "فلم دیکھنے جائیں گے۔"

وہ بجلی کی تیز روشنی میں آنکھیں جھپک جھپک کر دیر تک اسد کے چہرے کو بہت قریب سے دیکھتی رہی۔ پھر پکارگی اُس کے ہونٹ ذرا سے کانپے اور اسد کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ وہیں پہ بیٹھی بیٹھی اُس کی جانب بہہ نکلی

ہے۔ اسد نے اس کا چہرہ پھول کی طرح ہاتھوں میں لیا اور اُس کے آبرو کو، گال کو، ہونٹوں کے کناروں کو چومنے لگا — ایک ثانیے کے اندر سرد اور سفید پھڑکتے ہوئے تمار ہونٹوں نے اسد کے دہن کو ڈھانپ لیا۔ اُس کے بے چین ہاتھ ریڑھ کی ہڈی پہ پھیلتے، کمر کے خم میں اُترتے، پیٹھ کے اُبھار میں پیوست ہوتے ہوئے کسی لامتام شے کو گرفت میں کرنے کے لیے بھٹکنے لگے اور اندر، سُرخ اور سیاہ نم اندھیروں میں لڑتی، پھڑکتی، تیر کی طرح چھوٹتی ہوئی زبانیں چکر کاٹتی رہیں حتیٰ کہ اُن کے کسمساتے ہوئے، ساتھ ساتھ اُٹھتے اور تُند ہوتے ہوئے، زور آوری سے دھکیلتے ہوئے ورشت جسم یک جان ہونے کی کوشش میں تنی ہوئی تار کی مانند کپکپانے لگے —— دفعتہً بادلوں سے روشنی کا ایک تختہ گرا جس نے اُن کی آنکھوں کو جھٹکے سے کھول دیا، اور ایک مہیب گرج نے انہیں ایک دُوسرے کی لپیٹ سے دھکا دے کر نکال دیا۔ یاسمین پہلو کے بل گرتے گرتے بچی۔ اسد کمر کو ذرا سا خم دیے، ہاتھ ہوا میں اُٹھائے، جنگل پہ مرکوز تھا۔ یہیں ہے، کسی نے اُس کے دل میں کہا، یہیں پہ ہے۔ آواز اتنے قریب سے آئی تھی جیسے یہیں جنگل کے کنارے پر ہو۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" یاسمین نے سانس روک کر پوچھا۔ "چلو چلیں۔"

اسد اسی حالت میں کھڑا دائیں سے بائیں نظر گھماتا رہا۔ بار بار روشن ہوتا ہوا جنگل یکسر خالی تھا۔

"اسدی، کیا دیکھ رہے ہو؟"

"چُپ رہو۔" وہ بولا۔

"اسدی، یہ تو بادل گرجا تھا۔" یاسمین کے حلق میں آنسو آکر اٹک گئے، "یہ تو بادل کی گرج تھی۔" اُس نے زیادہ کی، "چلو۔" اُس نے اسد کے اُٹھے ہوئے بازو پر ہاتھ رکھا، "اسدی، خُدا کے لیے میری بات سُنو۔ میری بات ......" اُس کی آواز رُک گئی۔ وہ آنکھوں میں حیرانی اور خوف کے آنسو لیے اُس شخص کو دیکھتی رہی جس کے اندر سے گزر کر وہ ابھی آئی تھی اور اب جو اُس کے لیے اجنبی بن چکا تھا۔ آہستہ آہستہ بادل اور بجلی کا طوفان، کھُل کر برسے بغیر اُن کے سر سے گزر گیا۔ اسد بازو گرا کر، اُس سے الگ کھوہ کی دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ رات کی فضا صاف ہو چکی تھی۔

واپس آتے ہوئے وہ میدان کے بیچ میں تھے کہ شرق کے پہاڑوں کی جانب سے تڑتڑ کرتی ہوئی تیز فائر کی ایک مختصر سی آواز آئی۔ ایک لمحے کو رُک کر اُنہوں نے رات میں کان لگائے، مگر اب ہر طرف خاموشی تھی۔ شرق کی طرف بجلی کی ہلکی ہلکی چمک ابھی جاری تھی۔ گھر کے دروازے پہ یاسمین نے مُڑ کر ایک بار اسد کو دیکھا، ہٹ تھامے چند سیکنڈ ٹھٹک اُسے دیکھتی رہی، پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر اسد کے بالوں کو چھوا اور اندر چلی گئی۔

* * * * *

گھر کے دروازے سے اپنے کمرے کو جانے کے لیے اسد کو کچھ دور تک مطب کے احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ جانا پڑتا تھا جہاں سے مطب کا دروازہ نظر آتا تھا۔ دروازے کا ایک پٹ نیم وا تھا اور اندر مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ اسد اسے دیکھ کر رک گیا۔ رات کے اس وقت حکیم کا مطب میں آنا معمول کے خلاف تھا۔ صرف کبھی کبھی جب اِدھر اُدھر کے کسی گاؤں سے کوئی مریض حالتِ غیر میں چارپائی پر ڈال کر لایا جاتا تو اُسے رات کو اُٹھ کر آنا پڑتا، مگر اس صورت میں احاطے کے اندر مریض کی چارپائی رکھی ہوتی اور گرد اس کے عزیز و اقارب بیٹھے حقوں کے کش لگا رہے ہوتے۔ دروازہ پیٹ کر حکیم کو جگانے کے عمل سے آس پاس کے گھروں کے چند لوگ بھی جاگ اُٹھتے اور عموماً حال احوال پوچھنے کو نکل آتے۔ ولی بہرصورت موجود ہوتا۔ مگر احاطہ اس وقت سنسان پڑا تھا، اندر روشنی اتنی مدھم تھی کہ اسد کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا۔ اس وقت حکیم یہاں کیا کرنے آیا تھا اور اُس نے لیمپ اتنا نیچا کیوں کیا ہوا تھا؟ جب حکیم گھر سے نکلا تو اُسے یاسمین کی غیر موجودگی کا علم ہو گیا ہوگا؟ دروازے کی کنڈی تو اندر سے اتری ہوئی تھی۔ تو کیا اُس نے مطب میں آنے سے پہلے، اسد کے کمرے میں بھی جھانک کر دیکھا ہوگا؟ شاید دیکھا ہو۔ ہر چند کہ حکیم نے خود ہی ایک طرح سے اُن دونوں کو میل ملاپ کی ترغیب دی تھی، مگر اس کی پیٹھ پیچھے، اُس کی اجازت کے بغیر ملنا؟ اسد پھر گھر سے باہر؟ یہ تھے وہ خیالات جو اُس وقت وہاں کھڑے کھڑے، اندھیرے میں اُس مدھم سے نیم وا پٹ پر نظریں جمائے، اسد کے دماغ میں تیز تیز آ رہے تھے۔

تو گویا راز جو تھا فاش ہو چکا تھا۔ اُس کو پہلے ہی شک تھا کہ گاؤں میں دو ایک لوگوں کو اُن کے راز کا علم ہے۔ ولی ان میں سے ایک تھا۔ ولی گو احمق تھا، مگر دیہاتیوں کے مخصوص انداز میں چالاک بھی تھا۔ حکیم نے پھر کیا کیا ہوگا؟ یعنی جب اُس کو اُن کی غیر موجودگی کا علم ہو گیا، کیا وہ کچھ دیر تک گھر کے اندر اُن کے انتظار میں بیٹھا رہا ہوگا؟ اور جب وہ پھر بھی نہ لوٹے تو باہر نکل کر مطب میں آگیا ہوگا؟ شاید وہ اسی مصلحت کے پیشِ نظر مطب میں گیا ہو کہ ہم دونوں خاموشی سے لوٹ کر اپنے اپنے کمروں کو چلے جائیں۔ مگر اس کے لیے مطب میں جانے کی کیا ضرورت تھی، وہ خاموشی سے واپس اپنے کمرے میں بھی جا سکتا تھا۔ کیا یاسمین کو پتا چل گیا ہوگا؟ اونہوں، وُاس

نے اندھیرے میں سر ہلایا) وہ کنڈی لگا کر سیدھی اپنے کمرے کو چلی گئی ہو گی۔ اب حکیم واپس کیسے جائے گا؟ دروازہ اندر سے بند ہوگا اور وہ مزے سے سو رہی ہوگی۔ خدایا، اب کیا کروں؟ یاسمین کو مطلع کرنا ضروری ہے۔ اُس کی کھڑکی پر جا کر دو دفعہ تین تین بار انگلی بجاؤں اور اُسے بتاؤں کہ کم از کم جا کر کنڈی ہی اتار دے، یا پہلے جا کر اپنے باپ کے کمرے میں نظر ڈال لے کہ وہ وہاں پر ہے یا نہیں۔ اِس سے شاید صورتِ حال کچھ واضح ہو جائے۔ اسد کے دماغ میں یکدم گڑبڑ شروع ہو گئی۔ چلو، مزید وقت ضائع کیے بغیر چلو، چل کر کھڑکی کھلواؤ، ابھی وہ جاگ رہی ہوگی، چلو چلو، وہ بار بار اپنے دل میں دہراتا رہا اور وہیں پر کھڑا رہا، جیسے اُس کے پاؤں اُس زمین میں جڑ پکڑ گئے ہوں اور ہلائے نہ ہلتے ہوں۔ مطب کے اندر کوئی ایسی بات تھی جو اسے وہاں سے ہلنے نہ دیتی تھی، جیسے کہ اگر اُس نے ایک بار وہاں سے نظریں ہٹا لیں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائے گا۔ روشنی اندر بہت ہی مدھم تھی، اگر رات اتنی اندھیری نہ ہوتی تو شاید نظر بھی نہ آتی۔ اُس وقت اُسے خیال ہُوا کہ جیسے ایک سایہ سا دروازے کے آگے سے گزرا ہے۔ اُس نے چونک کر دونوں ہاتھ دیوار پر رکھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ سایہ جو ایک آدمی کا تھا دوبارہ دروازے پر نمودار ہُوا۔ اُس نے دروازے کا ایک پٹ کھولا اور دو قدم باہر نکل کر اندھیرے میں آکھڑا ہُوا، یوں کہ اُس کا اُوپر کا دھڑ روشنی کے مقابل نظر آتا رہا۔ وہاں پر اُس سائے نے ایک دوبار سر کو گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر پلٹ کر واپس مطب کے اندر چلا گیا، جیسے صرف تازہ ہوا میں سانس لینے کو باہر نکلا ہو۔ جاتے جاتے اُس نے دروازے کا پٹ بھیڑ دیا۔ یہ شبیہہ بہت مانوس تھی۔ اس کی چال ڈھال اسد کو جانی پہچانی لگی۔ کون ہو سکتا ہے، حکیم تو نہیں ہے۔ یہ اُس سے ذرا لمبے قد کا، کم عمر آدمی ہے، اسد نے سوچا۔ دروازے میں اب ایک پتلی سی درز رہ گئی تھی۔

اسد وہیں سے دیوار کر پھلانگ کر پنجوں کے بل بھاگتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ دروازہ کھول کر اندر جانے کی بجائے وہ درز سے آنکھ لگا کر دیکھنے لگا۔ کمرے کا جتنا حصّہ نظر آرہا تھا وہاں صرف آدھا تختہ اور اُس کے اُوپر سفید دیوار تھی جس پر تھرکتی ہوئی لیمپ کی روشنی سے پتا چلتا تھا کہ بتّی ٹمٹما رہی ہے۔ اسد نے دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھُلا اور میر حسن کی شبیہہ اُس کے مقابل کھڑی تھی۔ سب سے پہلا خیال جو اُسے دیکھنے پر اسد کو آیا وہ تھا کہ ارے، یہ تو میر حسن ہے! مَیں پہچان کیوں نہیں سکا؟

"میر—" وہ بات کرتے کرتے رُک گیا۔ میر حسن کی چمک دار آنکھیں خوف کے مارے اُبلی پڑتی تھیں اور اُس کے چہرے کی پیلاہٹ اُس تاریکی میں بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ ایک پرندے کی شکل میں بازو پھیلائے دونوں پٹ مضبوطی سے تھامے کھڑا تھا اور اُس کا جسم غیر ارادی طور پر اپنے بازوؤں پہ آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔

اسد نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" اسد نے سختی سے پوچھا۔

لڑکا اپنی آنکھوں میں حیرانی ہم لیے گنگ کھڑا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اسد نے اس کی کلائی پر اپنی گرفت نرم کیے بغیر اسے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ اس پر میر حسن میں گویا اچانک جان پڑ گئی۔ اس نے سر کو ایک جھٹکا دیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔" الفاظ اس کے منہ سے اُبل پڑے۔ اس کا جسم مدافعتی انداز میں اسد کو باہر کی طرف دھکیلنے اور دروازے میں کبھی دائیں کبھی بائیں کو سرکنے لگا، جیسے کمرے کو اسد کی نظروں سے اوجھل رکھنا چاہتا ہو۔ کمرے کے اندر نگاہ ڈالنے سے پہلے ہی میر حسن کے منہ سے نکلے ہوئے ان پانچ الفاظ نے اسد کے کانوں میں ایک دہلا دینے والی گونج پیدا کی، اور اس نے میر حسن کی نازک سی کلائی کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں بھینچ کر پوری قوت سے اُسے اندر کی طرف دھکا دیا۔ پہلی چیز جس پر اسد کی نظر پڑی وہ لیمپ تھا۔ اس کی مہین سی لو بری طرح کپکپا رہی تھی۔ پھر حکیم کی قدِ آدم چوڑی سی سیاہ الماری جو مقفل رہتی تھی۔ الماری اب وا پڑی تھی۔ اس کے متوازی خانے، جن میں سے کئی ایک لکڑی کے عمودی تختوں کی مدد سے مزید چھوٹے بڑے خانوں میں تقسیم کیے گئے تھے، شیشے کی بوتلوں، سفید اور سرخ مٹی کے مرتبانوں، کاغذ کی مختلف شکل اور حجم والی پڑیوں، خشک شاخوں کے چھوٹے بڑے گٹھوں، پتھر کے پیالوں اور دوسری حکمت کی اشیا سے اٹے پڑے تھے۔ نیچے فرش پر دیوان کے پاس حکیم کا بدن اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کی گردن نرمی ہوئی تھی اور دہنا گال زمین پر ٹکا تھا۔ ایک بازو پھیلا ہوا کہنی تک تخنے کے نیچے گھس گیا تھا۔ دوسرا کہنی پر سے عجیب مڑے تڑے انداز میں رکھا تھا۔ اس بازو کا ہاتھ بندوق کی نالی کو اس مضبوطی سے گرفت کیے ہوئے تھا کہ انگلیوں کے جوڑ سفید ہو چکے تھے۔ اسد کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کب اس کا ہاتھ میر حسن کی کلائی پر سے ڈھلک گیا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور لاعلم نظروں سے جھک کر دیکھنے لگا۔ اس کا فہم ایک لحظے کے لیے معطل ہو گیا۔ اتنا اندھیرا کیوں ہے؟ اس نے خفگی سے سوچا، کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ پلٹا، اور اس بے حرکت بدن سے بچتا ہوا ایک پاؤں تخنے پر رکھ کر آہستہ سے اسے پھلانگ گیا۔ لیمپ کے پاس جا کر اس نے بتی اونچی کی اور اسی راستے سے واپس آ کر، گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ منہ کے کونے سے خون خارج ہو کر ایک پتلی سی سیاہ لکیر بناتا ہوا کوئی چھ انچ کے فاصلے پر ایک بڑے سے بلبلے کی شکل میں فرش پر جم گیا تھا۔ پشت میں بائیں طرف کو قمیض کوئی تین انگل کے قریب چری پڑی تھی اور وہاں پر کھدر کے دھاگے خون میں خشک ہو کر سر اٹھائے کھڑے تھے۔ خشک ہوتے ہوئے خون سے بائیں طرف کی آدھی قمیض اور بازو کے کچھ حصے کا کپڑا

اکڑ کر اٹھا ہوا تھا۔ خون ایک ٹیڑھے میڑھے راستے سے گزر کر تھوڑے فاصلے پر فرش میں ایک نیچی سی جگہ میں جمع ہو رہا تھا جہاں وہ اب سطح سے جمنا شروع ہو چکا تھا۔ نچلے دھڑ کے کپڑے بے داغ تھے اور دونوں ٹانگیں سیدھی رکھی تھیں جیسے کوئی آرام سے پیٹ کے بل سویا ہو۔ بندوق کا دستہ الگ دیوار کے ساتھ ایک عجیب زاویے پر کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُسے زور سے پھینکا گیا ہو اور دیوار پہ لگ کر نیچے آ گرا ہو۔ دیوار پہ اُس کی ضرب کا نشان تھا، اور دستے کے ٹرٹے ہوئے کونے پر دیوار کی مٹی لگی نظر آ رہی تھی۔ بے خیالی میں جُھک کر اسد نے تین اُنگلیوں سے جیکم کے چہرے کو چھُوا اور اس طرح ہاتھ کھینچ لیا جیسے اُسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ اُس لمس کی دہشت اور کراہت سے سردی کی ایک لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی اور گویا پہلی بار ساری صُورتِ حال پُوری قوت سے اُس پر واضح ہوئی۔ آنکھیں ادھ کھُلی اور بے نور تھیں۔ وہ ایک سُرعت کے ساتھ نعش کے اُوپر سیدھا ہوا۔

"یہ ——— یہ ———" وہ نعش کی طرف اشارہ کر کے ہکلاتے ہوئے بولا۔ پھر اُس کی زبان بند ہو گئی۔

میر حسن اپنی جگہ پر کھڑا، پھٹی پھٹی چمک دار آنکھوں سے اسد کو دیکھتا ہُوا، کئی لمحوں تک بات کرنے کو مُنہ کھولتا اور بند کرتا رہا۔ آخر آواز اس کے حلق سے نکلی:

"مَیں نے نہیں کیا۔"

"حرامی۔"

"مَیں نے نہیں کیا ——— اللہ کی قسم۔"

"کِس نے کیا ہے؟"

"مجھے نہیں پتا ——— مَیں تو آیا ہی ہُوں۔" ——— آواز حلق میں پھٹ گئی۔

"کِس نے؟ کِس نے؟ اور کِس نے کیا ہے؟"

"کِسی اور نے کیا ہے ——— مجھے نہیں پتا۔"

"مادر . . . . تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"مَیں نے نہیں کیا۔ نہیں کیا۔ ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ مَیں بے قصُور ہُوں۔"

"تم نے اسے قتل کر دیا ہے۔ مار ڈالا ہے،" اسد چیخا، "مَیں نے خود دیکھا ہے۔"

"تم نے نہیں دیکھا۔ کچھ نہیں دیکھا۔ مَیں تو آیا ہی ہُوں۔" میر حسن اپنے پنجوں پہ ذرا سا اُٹھا اور ایک سیکنڈ تک وہیں رُکا رہا، جیسے اُڑنے کے لیے پر تول رہا ہو۔ پھر اُس نے بدلی ہُوئی حیرت زدہ آواز میں، جس میں انتہائی سہم کی پکار تھی، ہچکیے سے کہا، "تمہیں یقین نہیں؟" اور ایک چھلانگ لگا کر نعش کو پار کر گیا۔ اسد نے اُسے روکنے کے

لیے ہاتھ بڑھایا۔ مگر دوسری ہی چھلانگ میں وہ اسد کی بغل سے نکل کر دروازے سے باہر جا چکا تھا۔ اسد توازن قائم نہ رکھ سکا اور اُلٹ کر تختے پر جا گرا۔ پھر وہ تیزی سے اُٹھ کر بھاگا، مگر چند ہی قدم اندھیرے میں گیا ہو گا کہ رُک گیا۔ عجیب نامعلوم طریقے پر اُسے احساس ہُوا کہ تعاقب بے سُود تھا، کہ لڑکا اُس سے کہیں تیز پا تھا، اور اِس گاؤں کے گھر گھر سے واقف تھا۔ کھلکھلا کر اُس نے اندھیرے میں مُنہ اُٹھایا اور پُورے زور سے چیخا :

" بدمعاش —— بھاگ کر کہاں جاؤ گے —— میں بتا دوں گا "

تاریکی میں سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز بھی نہ آئی۔ لڑکا بھُوت بن کر غائب ہو چکا تھا۔ کچھ دیر تک اسد وہاں کھڑا اپنے الفاظ کی بے صُوت بازگشت کو کانوں میں سنسناتے ہُوئے سُنتا رہا۔ اُس نے اپنے ذہن کی الجھن کو دبانے کی کوشش کی۔ بہت آہستہ آہستہ، جیسے گہری دُھند میں سے، صورتِ حال کی حقیقت اُس کے اُوپر واضح ہونے لگی —— اُس کی پُشت پر ایک کمرہ ہے، جس میں ایک نعش پڑی ہے۔ اُس کے معدے میں تیزابی بھنور سا پڑنا شروع ہُوا اور سینہ بند ہونے لگا۔ سانس اُوپر چڑھ رہی تھی۔ وہ پلٹ کر دروازے تک گیا اور ایک پٹ کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے بیٹھ جانا چاہیے تھا، مگر وہ دروازے کو پکڑے کھڑا انتظار کرتا رہا۔ اُس وقت سانس کو چڑھتے ہوئے دیکھ کر اُس توقع اور انتظار میں اُسے بے انتہا سکون محسوس ہوا —— اس انتظار میں کہ سانس کا اس قدر غلبہ پالے، اُس کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لے، اپنے آپ میں اُلجھا لے، تاکہ وقتی طور پر ہی سہی، مگر اس مصیبت سے چھُوٹ جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا، کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا، کوئی واقعہ، کوئی بات —— اُس وقت فی الواقع اُسے قوی اُمید تھی کہ سانس کا ریلا گزر جانے کے بعد حالات میں کوئی تبدیلی آ جائے گی، کوئی نہ کوئی آن پہنچے گا، اُس کو چھٹکارا دلانے، اُس کا ہاتھ بٹانے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکلے گا۔ ساری نشانیاں موجود تھیں، وہ دروازے کو تھامے سر نیہوڑائے کھڑا انتظار کرتا رہا، اور ایک عجیب بات ہوئی۔ سانس کا ریلا نہ آیا۔ پہلے ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ جب نشانیاں ظاہر ہو تیں، سانس آ کر رہتی۔ اس دفعہ عمر میں پہلی بار دغا دے گئی تھی۔ اُس کا حلق مُستقل اُٹھتا اور بیٹھتا رہا، مگر سانس کم و بیش برابر چلتی رہی۔ اسد کو جیسے سانپ سُونگھ گیا ہو۔ اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا۔ اب کیا ہو؟ سب سے بہتر ترکیب تو یہ ہے کہ لاش کو کھینچ کر تختے کے نیچے کر دو، لیمپ کو پھُونک سے بجھا دو، اور جا کر گھر میں سو رہو۔ صبح گاؤں والے خود ہی پتا کرتے پھریں گے کہ کیا ہُوا کیا نہ ہُوا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا، اور تختے پہ پاؤں رکھ کر الماری کے برابر جا کھڑا ہُوا۔ کسی بوتل یا مرتبان پر لیبل نہ تھا۔ لیبل کیوں نہیں لگے، اُس نے ذہن پر زور دے کر سوچا۔ اتنی دواؤں کی پہچان کیسے رکھتا ہے۔ پھر اُسے یاد آیا کہ وہ کئی بار پہلے بھی اس بات پر غور کر چکا ہے۔ فرش پر سے نظریں چُراتے ہُوئے اسد نے الماری کی ایک ایک شے

گر باری باری دیکھا اور ملگجے پتھر کے خوبصورت کاغذی کٹوروں میں، جو کبھی استعمال میں نہ آئے تھے، دیکھتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ وہ گلا پھاڑ کر ایک ایسی چیخ لگائے کہ سویا ہوا گاؤں جاگ پڑے۔ "خون!" پھر وہ گاؤں کے کسی بڑے بوڑھے کے گھر جائے اور اس کا دروازہ پیٹ پیٹ کر سارا ماجرا کہہ سنائے، پھر ڈاک بنگلے جا کر شاہ رخ کو جگائے۔ تختے سے اتر کر وہ باہر کی طرف چل پڑا۔ احاطے میں ایک جگہ رک کر اس نے اندھیرے میں دیکھا کہ حکیم کی نعش اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے۔ اب تو یہ نعش یہاں پڑی ہے اور میں یہاں پہ موجود ہوں، اس نے سوچا۔ بات نکل آئے گی کسی نہ کسی طرح۔ چھپانے سے کیا فایدہ؟ اب تو مجھے اس سے نبٹنا ہی ہے۔ وہ اندھیرے سے واپس لوٹ آیا۔

احتیاط سے قدم رکھتا ہوا وہ لاش کے سر کی طرف پہنچا اور وہاں بیٹھ کر اس نے بندوق کی نالی کو کھینچنے کی کوشش کی۔ مردہ ہاتھ کی گرفت تالے کی طرح اس کو لگی تھی۔ ایک دو بار کوشش کرنے کے بعد اس نے پاؤں اس ہاتھ کے گرد جمائے، اور دونوں ہاتھوں کے زور سے کھینچ کر آخر نالی کو اس آہنی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ اسی میں اس کی سانس پھول گئی، اور جب وہ کھڑا ہوا تو ایک اندھیرا سا اس کی آنکھوں کے آگے سے گزر گیا جس میں ستارے چھوٹ رہے تھے۔ اسے خیال ہوا کہ اس کا دل بیٹھنے والا ہے۔ اس نے جھک کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہوا دستہ اٹھایا، دونوں چیزوں کو تختے پر رکھا، اور تختے پہ کھڑے ہو کر الماری کے اوپر والے خانے سے بندوق کا لمبا سا ڈبا نکالا جو وہاں، شیشیوں اور مرتبانوں کے پیچھے کھلا ہوا پڑا تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے آگے سے کئی چھوٹی بڑی شیشیاں اٹھا کر نچلے خانے کی چوڑے منہ والی برنیوں کے اوپر رکھ دی گئی تھیں۔ خانے کے تختے پر گرد میں ان کے پیندوں کے گول نشان موجود تھے۔ قینچی کہاں ہے؟ ڈبے میں تو نہیں۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا، قینچی کہیں غائب تھی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر گھٹنے زمین پر ٹیک کر تختے کے نیچے نظر ڈالی تو قینچی دوسرے ہاتھ کے قریب زمین پر پڑی ہوئی دکھائی دی۔ تینوں چیزیں احتیاط کے ساتھ اس نے ڈبے میں بند کیں، اور ڈبے کو میز پہ رکھ دیا۔ پھر وہ تختے پر چڑھا اور ایک ایک شیشی کو اٹھا کر اس کے اپنے دائرے میں فٹ کر کے رکھنے لگا، اس احتیاط کے ساتھ کہ ارد گرد کی گرد میں کوئی نشان نہ پڑے۔ جب وہ شیشیوں کو اپنی جگہ پہ رکھ چکا تو بلا وجہ انہیں گننے لگا۔ بعد میں جب کبھی اس نے اس وقت کے بارے میں سوچا تو اسے خیال آیا کہ غالباً یہی لمحات تھے جب اسے اپنے قوا پر کسی حد تک اختیار حاصل ہونا شروع ہوا تھا۔ وہ تعداد میں کل انیس تھیں۔ یہ کام اطمینان بخش طور پر ختم کر کے اس نے الماری بند کی اور اسے تالا لگایا، جیب سے رومال نکال کر چابی اور تالے کو پونچھا اور چابی حکیم کے کرتے کی دائیں پہلو والی جیب میں ڈال دی۔ رومال سے ہی اس نے حکیم کے ہاتھ پر لگی اپنے جوتوں کی مٹی کو اچھی طرح سے صاف